پروفیسر محمد صدیق

اُردو کے خوش نویس شعرا

شاعری اور خوش نویسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس طرح شاعر خیالات کو منظم الفاظ کا جامہ پہنا کر خیالات میں روانی پیدا کرتا ہے، بالکل اسی طرح ایک خطاط اپنے مزاج، اپنے طبعی رجحان اور فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر منتشر حروف کو خوش نما لباس میں ملبوس کرتا ہے جس سے شاعر اور خطاط کے ہم رنگ ہونے کا احتمال ہونے لگتا ہے۔

زمانۂ قدیم میں ہر شاعر خوش نویس اور تقریباً ہر خوش نویس شاعر ہوتا تھا۔ اگرچہ آج زمانے کی بے قدری نے اس ہم آہنگی کو بڑا ضعف پہنچایا ہے، لیکن آج بھی تلاش کریں تو ایسی مثالیں مل جائیں گی۔

یہ مقالہ ہمارے اسی خیال کی ترجمانی کرتا ہے، بلکہ ہمارے ذوق اور وجدان کی ایک آواز ہے جسے الفاظ کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خطاط شعرا کے اس تذکرے کی ترتیب اُردو شعرا کے معروف اور ضخیم تذکرہ "خم خانۂ جاوید" کے بالاستیعاب مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ "خم خانۂ جاوید" میں ہر شاعر کے کلام کے منتخب اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ ہم نے ان اشعار میں سے صرف دو یا تین کا انتخاب کیا ہے، مگر قارئین کی اطلاع کے لیے "خم خانۂ جاوید" میں دیئے گئے کُل اشعار کی تعداد کو شاعر کے حالات کے اختتام کے فوراً بعد درج کر دیا گیا ہے۔ مثلاً خم خانۂ جاوید میں مرزا احسن علی احسن کے اشعار کی تعداد ۱۹ دی گئی ہے۔ لیکن ہم نے صرف دو شعر منتخب کیے ہیں۔ احسن کے حالاتِ زندگی کے اختتام پر قوسین پر ۱۹ لکھ دیا گیا ہے۔

لالہ سری رام

لالہ سری رام کا سلسلۂ نسب شہنشاہِ ہندوستان اکبرِ اعظم کے وزیر راجہ ٹوڈرمل تک پہنچتا ہے۔ لالہ جی ۴ دسمبر ۱۸۷۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام رائے بہادر مدن گوپال تھا۔ وہ ایم۔اے، بار ایٹ لا تھے۔ ان کا شمار لاہور اور دہلی کے ممتاز وکلا میں ہوتا تھا۔ لالہ جی

نے دہلی اور لاہور میں تعلیم پانے کے بعد ۱۸۹۵ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم۔اے انگریزی کیا۔ تھوڑے عرصے بعد آپ کو جج بنا دیا گیا، مگر ۱۹۰۴ء میں ادبی مصروفیات کی بنا پر ان کو یہ نوکری چھوڑنا پڑی۔

لالہ جی فراخ دل، وسیع المشرب، ملنسار اور با اخلاق شخصیت کے مالک تھے۔ شاعر نہیں تھے، مگر بہترین سخن فہم، سخن شناس اور شاعر نواز تھے۔ "زمانہ" اور "مخزن" کے ابتدائی ادوار میں لالہ جی کے کئی ادبی اور تنقیدی مضامین شائع ہوئے۔

لالہ جی کی لائبریری ادب اور آرٹ کی حسین گیلری تھی۔ لالہ جی کی لائبریری میں فارسی، عربی، اردو اور ہندی کی نادر، کم یاب اور نایاب کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ نہ صرف کتب بلکہ قلمی تصاویر، خطاطی کے بہترین نمونے، پرانے شاہی فرامین اور مسودات بھی خاصی تعداد میں ان کے کتب خانے کی زینت تھے۔ ان کی موت کے چند سال بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کا یہ نادر ذخیرہ بنارس یونیورسٹی کو تحفتاً دے دیا گیا تھا۔

لالہ جی کا عظیم کارنامہ "تذکرہ ہزار داستان" یعنی "خم خانۂ جاوید" ہے۔ یہ معروف تذکرہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس تذکرے کی چار جلدیں تو لالہ جی کی زندگی ہی میں شائع ہو گئی تھیں، مگر پانچویں جلد کو ان کے بہترین دوست اور رفیق پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے مرتب کر کے چھپوایا۔ لالہ جی نے ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء میں اس دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔

آرام

آرام، رائے پریم ناتھ، کھتری، دہلی کے قدیم رؤسا میں تھے۔ ان کے بزرگ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں سرکاری ملازم تھے اور یہ خود بھی صاحبِ اقتدار تھے۔ آخر عمر میں تارک الدنیا ہو کر بندرابن (متھرا) میں جا بسے تھے۔ تیراندازی اور خوش نویسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ دو ہزار شعر کا ایک دیوان یادگارِ زمانہ ہے۔ ان کے کلام میں کسی قسم کی جدت اور بلند پروازی نہیں پائی جاتی۔ البتہ کلام کی موزونی اور زبان کی سادگی میں کچھ شبہ نہیں:

خون آنکھوں سے نکلتا ہی رہا　　دل کا فوارہ اچھلتا ہی رہا

کون غم خواری کرے آرام کی ایک مجنوں تھا سو جلتا ہی رہا

آغا

آغا، مرزا آغا جان عرف آغا صاحب، دہلی کے باشندے تھے۔ اصل میں عیسائی تھے، مگر اپنے استاد سید محمد امیر پنجہ کش کی ہدایت و تلقین سے مسلمان ہو گئے تھے۔ خوش نویسی میں ایسی مشق بہم پہنچائی تھی کہ سید محمد امیر پنجہ کش کے شاگردوں میں ان سے بہتر کوئی نہ تھا۔ اخیر دم تک ریاست الور میں ملازم رہے۔ ۱۲۷۴ھ کے جہادِ حریت میں یہ دونوں استاد شاگرد گوروں کے ہاتھ سے گولیاں کھا کر راہیِ ملک بقا ہوئے۔ کچھ عرصہ ریاست جھجر میں بھی ملازم رہے تھے۔ وہاں نواب صاحب نے ایک لاکھ روپیہ کے صرف سے ایک نہایت بیش بہا اور قابلِ قدر گلستان ان سے لکھوائی۔ پھر الور میں ملازم ہو کر ویسی ہی دوسری گلستان لکھی۔ یہ دونوں نسخے خوش خطی اور خوبیِ نقش و نگار کے باعث عدیم النظیر ہیں۔ جھجر والی گلستان مہاراجہ منگل سنگھ والیِ الور نے خرید کر دورانِ سیاحتِ پنجاب میں ۱۸۰۸ء میں مہاراجہ راجندر سنگھ والیِ پٹیالہ کو بطور ہدیہ دے دی تھی۔ دوسرا نسخہ اب تک الور کے کتب خانے کی زینت ہے۔ اس پر متعدد نمائشوں میں تمغہ بھی ملا ـــــ آغا صاحب گاہے گاہے فکرِ سخن بھی کرتے تھے۔ دو شعر بطور یادگار درج تذکرہ کیے جاتے ہیں۔

کوئی دارا، کوئی جم اور کوئی اسکندر ہوا داغ سر اپنا ہمیں نامِ خدا افسر ہوا
سرخ ہے مو باف قاتل آج دیکھا چاہیے قصد اس قاتل کا اب ہے کس کے شبخوں پر ہوا

احسن

احسن، مرزا احسن علی، ان کے نام میں کچھ اختلاف ہے۔ قاسم نے اپنے تذکرے میں احسن قلی لکھا ہے۔ مرزا علی لطف اور صفیر بلگرامی نے اپنے تذکروں میں صرف مرزا احسن نامی خوش نویس تھے۔ پہلے میر ضیاء الدین ضیاؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ پھر مرزا رفیع السودا کو استاد بنایا۔ لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کی سرکار میں بہ زمرۂ شعرا داخل ہوئے۔ مصحفی نے اپنے تذکروں میں لکھا ہے کہ اس شاعر کے اشعار ظرافت آمیز ہوتے تھے اور یہ شخص پہلے خواجہ محمد یونس خان کی خدمت میں رہا، بعد ازاں نواب آصف الدولہ مرحوم کے ہاں چلا آیا۔ ۱۲۱۵ھ میں کئی برس سے

سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں کی رفاقت میں ایام زندگی بسر کرتے تھے۔ انھوں نے فنِ نظم میں اور فنون سے زیادہ نام پیدا کیا۔ بہرحال حضرت احسن صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کے کلام میں لطافت و فصاحت دونوں مزے ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو : (۱۹)

اسی لیے تو میں تجھ سے خفا ہوں اے احسن ـــــ گھڑی گھڑی مرے پاؤں کو چشمِ تر نہ لگا
سجدہ گہ ہے، خاکِ احسن اب تو ساری خلق کی ـــــ جان دی تھی اس نے کس کے حسرتِ پابوس میں

احسن

احسن، حکیم مظہر حسن خان ولد حکیم محمد مجتبیٰ خان باشندہ رام پور۔ خط نستعلیق میں کامل اور ہفت قلم ہیں۔ فن سخن میں منشی مظفر علی اسیر سے استفادہ کیا ہے۔ ابتدائے شوق میں مرزا غالب کو بھی چند غزلیں دکھائی تھیں۔ طب میں قرابادین مختصر تحریر فرمائی اور عروضِ سیفی کا اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ۱۸۸۶ء میں ایک رسالہ موسوم بہ خورشید افق بھی جاری کیا تھا۔ تذکرہ انتخاب یادگار مولفہ امیر مینائی مرحوم کی ترتیب کے وقت ان کی عمر چھبیس برس کی تھی۔ کلام حاضر ہے: (۱۲)

اتنا تو میرے عشق نے آخر اثر کیا ـــــ مضطر ہوں میں یہاں وہ وہاں بے قرار ہے
کبھی زندہ کبھی مردہ ہیں جب سے تیری فرقت ہے ـــــ قیامت ایک سنتے تھے یہاں ہر دم قیامت ہے

ادیب

مولوی سیف الحق مرحوم ادیب دہلوی ابن مولوی محمد احسان الحق مغفور خلف الصدق مفتی محمد اکرام الدین خان بہادر صدر امین (سب جج) دہلی — شاہ عبدالحق محدث کی اولاد، اہلِ اسلام کے ایک نامی گرامی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ دو سو برس سے زیادہ گزرے، شیخ الاجل شاہ عبدالحق کے اسلاف نے علم و عمل، رشد و ارشاد کے شوق میں وطن قدیم بخارا کو خیرباد کہہ کر دہلی میں طرحِ اقامت ڈالی۔ اور علومِ حدیث کی اشاعت سے اپنے مذہب اور قوم کو مستفیض کیا۔ شاہ صاحب کا مزار سرزمینِ مہرولی معروف بہ قطب صاحب میں کنار حوضِ شمسی واقع ہے۔

مشہور ہے کہ عموماً اس خاندان کے بچے جاہل نہیں ہوتے۔ چنانچہ محدث علیہ الرحمہ کے ڈھائی سو برس بعد سیف الحق ۱۸۴۶ء میں بمقام دہلی محلہ مفتی صاحب پیدا ہوئے۔ خاندانی تربیت تو تھی ہی مگر باعث صد حیرت اور استعجاب یہ امر ہے کہ مکتب اور سرکاری مدرسے میں صرف

معمولی عربی، فارسی اور برائے نام انگریزی تعلیم پائی، جس کی معراج مڈل کے درجے تک تھی۔ ادیب کی اچھوتی اور ہونہار طبیعت نے وہ قابلیت و استعداد فراہم کرلی کہ اچھے اچھوں کی ٹکر جھیلنے لگے اور لڑکپن ہی میں قابلِ امتثال لیاقت حاصل کرلی۔ شعر و سخن کا شوق بچپن سے رفیق تھا۔ خود بھی شکیل و وضعدار تھے اور حسن پرستی کا مادہ ازل سے ان کے خمیر میں ودیعت ہوا تھا۔ شروع میں مرزا یوسف علی خان عزیز شاگرد مرزا غالب سے تلمذ اختیار کیا اور کئی برس تک ان کی روش پہ کہتے رہے۔ ایک دفعہ کسی مشاعرے میں غزل پڑھی جس کا مطلع یہ ہے:

لے جاؤ میرے سینے سے ناوک نکال کے پر دل نکل نہ آئے کہیں دیکھ بھال کے

سنا ہے کہ مرزا غالب بھی موجود تھے۔ پاس بلا کر پیار کیا اور فرمایا کہ "میاں سیفو۔ ہمارے پاس آیا کرو، آج سے تم ہمیں بتائیں گے۔" مرزا غالب کی توجہ سے اور ہی رنگ پیدا ہوگیا۔ جب روزگار کی ضرورت پڑی تو کچھ دن عدالت منصفی میں نائب ناظر رہے لیکن انشا پردازی کی خداداد قابلیت نے سرکاری خدمت کی قیود کا پابند رہنا گوارا نہ کیا، اس لیے اخباری دنیا میں قدم رکھا۔ "میونسپل گزٹ" نامی ایک پرچہ نکالا جو کچھ دنوں بڑی دھوم سے چلا۔ اس میں اعلیٰ درجے کے شاعرانہ مضامین اور غزلیات شائع کرتے رہے۔ پھر جب یہ پرچہ بند ہوگیا تو مختلف اخباروں کو اپنے مضامینِ نظم و نثر سے معقول امداد دیتے رہے۔ اس اثنا میں انجمن قصور کے سکرٹری ہوکر وہاں چلے گئے اور انجمن مذکور کا رسالہ بڑی کامیابی سے چلاتے رہے۔ جب وہاں سے جی اوچاٹ ہوا تو لاہور آکر کچھ دن سررشتہ تعلیم میں ملازم رہے۔ پھر کچھ عرصہ "کوہ نور" کے اڈیٹر رہے۔ اکثر اخبارات میں علمی مباحثوں میں حصہ لے کر اس زمانے کے نامی فاضلوں، شاعروں اور لیڈروں سے اُلجھ پڑے۔ نازک مزاجی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ "رفیقِ ہند" کے بعض مضامین سے ناراض ہوکر اس کے جواب میں "شفیقِ ہند" نامی پرچہ لاہور سے جاری کیا، جس کے ساتھ "نسیمِ صبح" اور "شامِ وصال" کے نام سے دو ضمیمے بھی نکلتے تھے۔ ان پرچوں کا ایک ایک فقرہ شوخی سے بھرا ہوا اور مذاق میں ڈوبا ہوتا تھا۔ الغرض پنجاب میں آپ نے اچھی شہرت حاصل کرلی اور نامور لیڈر آپ کی قابلیت کا لوہا مان گئے۔ آپ کی طبیعت میں غضب کا استحضار تھا، وقت پر سوجھتی تھی اور خوب سوجھتی تھی۔ غالب کے تلمذ نے آپ کے کلام میں ایک عجیب شان پیدا کردی، وہ یہ کہ مومن اور غالب کے رنگِ کلام کو

سمو کر جدت پسندی سے ایک ایسا دلچسپ اور پسندیدہ رنگ اختیار کیا جس میں فصاحت و بلاغت، شوکتِ لفظی، مناسبتِ شعری اور نازک خیالی سب اپنی اپنی جگہ جداگانہ شان دکھاتی تھیں۔ اردو فارسی دونوں زبانوں کا کلام نہایت آب دار و بلند پایہ ہے، مگر ان کے فطرتی استغنا سے بہت سا حصہ تلف ہوگیا اور جو کچھ بچ رہا وہ بھی نایاب ہے اور چھپنے کی توقع نہیں۔ بڑی مشکل سے تھوڑا سا کلام ہمارے ہاتھ لگا ہے۔ نثر کا بھی کافی ذخیرہ آپ سے یادگار ہے۔ تاریخ گوئی میں اپنا نظیر ہی نہ رکھتے تھے۔ بات بات میں مادۂ تاریخ نکالتے تھے۔ اکثر تاریخی فقرے بولتے تھے۔ سینکڑوں قطعات، بیسیوں عرضیاں اور خطوطِ تاریخی، جن کے ہر دل آویز فقرے سے سن و سال نکلتا تھا، لکھ ڈالیں۔ چنانچہ حضور نظامِ دکن کے ولی عہد کی پیدائش پر ان کے تاریخی نام اور قصیدے، قطعے اس کثرت اور عمدگی سے لکھے کہ دھوم مچ گئی۔ عجیب ترین قصہ ان کی برجستہ تاریخ گوئی کا یہ ہے کہ ۱۳۰۲ھ میں ان کے بھائی مولوی محمد انوار الحق میر منشی راجستان نے اپنی بیٹی کی شادی کی، وقتِ وداع سامانِ جہیز کی فہرست لکھنے کی خدمت ان کے سپرد ہوئی، چنانچہ فہرست جو بڑی لمبی تھی مع عنوان بقید نام جنس تمام و کمال تاریخی ہے۔ ہر شے کے ساتھ ایسے موزوں اور مناسب الفاظ ملائے ہیں کہ ہر جملے میں تاریخ موجود ہے۔ فصیح البیانی کے ساتھ ساتھ صحتِ لفظی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ طبیعت میں تحقیقات کا مرض، اس پر اپنی مادری ٹکسالی اردو میں اختراعوں کا شوق جس کی مناسبت اور دل فریبی زبان اور قلم سے نکلتے ہی قبولیتِ عامہ کا مرتبہ حاصل کر لیتی تھی۔ مختلف جلسوں اور قومی کانفرنسوں میں وقتاً فوقتاً لکچر بھی دیا کرتے تھے جس کی وجہ سے چھوٹی سی عمر میں اپنی لیاقت اور ذکاوت سے ہندوستان میں اچھا نام پیدا کر لیا تھا۔ آخر اسی شہرت کی بدولت سرکار آصفیہ حیدر آباد دکن میں بمشاہرہ چار سو پچاس روپیہ گورنمنٹ رپورٹر کے معزز عہدے پر ممتاز ہوئے۔ دکن میں سات آٹھ ہی برس کی ملازمت میں ایسا رسوخ پیدا کر لیا کہ صدہا کے رشک و حسد کا باعث تھا۔ حضرت داغ مرحوم جب پہلی مرتبہ دکن تشریف لے گئے تو آپ ہی کے مکان پر عرصہ تک فروکش رہے۔ پھر جب دہلی واپس چلے آئے تو دوبارہ آپ ہی کی تحریک سے عازمِ دکن ہوئے تھے، اور ان کے تقرر میں بہت کچھ آپ کی مساعی جمیلہ کا دخل تھا۔ نوک جھوک کی عادت ایسی تھی کہ کسی سے چوکتے نہ تھے۔ امیر، ارشد دہلوی، مرزا داغ، راسخ، مولانا شوکت،

احسن سے مزے دار چونچیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے مولوی عبدالرحمٰن راسخ ساکن نبت نے غالب کی طرز میں غزل لکھی جس کے مقطع میں غالب مرحوم پر مُنہ آگئے۔

کہیں چھپ کے مے پیتے ہیں شاید حضرت راسخ　　ترے اشعار بھی غالب کی ٹکر ہونے جاتے ہیں

پھر کیا تھا ادیب نے میاں ملنگ سبزی فروش سے اسی زمین میں غزل پڑھوائی جس کا ایک شعر یہ ہے:

عجب جھم جھم کا مضمون ہے کہ ہیں بس اپنے دعوی میں　　نبت والے بھی اب غالب کی ٹکر ہوتے جاتے ہیں

مختصر یہ کہ ادیب مرحوم خوبرو، خوش وضع، رنگین طبع، نازک خیال، خوش تقریر، خوش تحریر آدمی تھے۔ خوش نویسی میں بھی اچھا ملکہ تھا۔ مزاج میں لاپروائی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ چنانچہ آپ کے دریائے معیشت میں اکثر جزر و مد کا عالم رہتا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کو دق کا مرض، جس میں ان کا انتقال ہوا، زیادتی فکرِ سخن کی بدولت ہوا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ شراب کی زیادتی اس مرض مہلک کا باعث ہوئی۔ آخر کار علوم الشیائی کا یہ زبردست ادیب و ماہر جوفنِ عروض میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا، ۴۵ برس کی عمر میں جون ۱۸۹۱ء میں بمقام دہلی فوت ہوگیا اور قطب صاحب میں اپنے مورثِ اعلیٰ کے مزار کے قرب میں دفن ہوا۔ دم نکلتے نکلتے بھی ہوش و حواس درست تھے، نویں محرم کو انتقال سے چند گھنٹے پیشتر جس وقت تعزیہ گشت کناں ترابہ بیرم خان میں آپ کے مکان کے متصل پہنچے تو ماتمی تاشہ کی آواز سے چونک کر آپ نے اپنے عزیز کو اپنے پاس بلایا اور یہ رباعی لکھوا کر فرمایا کہ اسے تعزیے سے لٹکا آؤ۔ اس رباعی کو اس طوطیِ شکرستانِ سخن کی آخری نغمہ سنجی کہنا ناموزوں نہیں ہے:

بیمار ہوں، ناتواں ہوں، زار ہوں میں　　وقفِ غم و درد و رنج و آزار ہوں میں
اے سبطِ رسول، راکبِ دوشِ نبیؐ　　کچھ عقدہ کشائی کیجیے ناچار ہوں میں

آپ کے سب سے چھوٹے صاحب زادے مولوی انعام الحق بی اے ہونہار اور لائق نوجوان ہیں اور فی الحال فارس میں کانسل برطانیہ کے دفتر میں ایک معزز عہدے پر فائز ہیں۔ انتخابِ کلام حاضر کیا جاتا ہے: (۸۱)

باز آتا نہیں الفت سے کسی طرح ادیب　　شوق ہے آپ اُسے اپنی گرفتاری کا

جان جائیں گے یہ سب آپ مرے بعد ادیب ـــــ علم کیا چیز ہے ہوتی ہے لیاقت کیسی
رہا گر یہی بت پرستی کا عالم تخلص ادیب اپنا رامی کریں گے

اشرف

شیخ اشرف علی نام، خلف شیخ مظہر علی ساکن مصطفیٰ آباد عرف کسمنڈی جو مضافاتِ لکھنؤ میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جناب اشرف کی عمر کا زیادہ حصہ بلکہ ساری عمر لکھنؤ میں گزری۔ اگرچہ ان کا دائرۂ علم زیادہ وسیع نہ تھا مگر ضروریاتِ شعری کے لیے کافی تھا۔ نہایت اعلیٰ درجے کے خوش نویس تھے۔ کامل چالیس برس تک ان کو منشی نولکشور کے مطبع سے تعلق رہا۔ نہایت خلیق اور باوضع آدمی تھے۔ کیا لباس و کیا طریقِ رہائش جملہ امور میں جیسا جوانی میں رنگ تھا ویسا ہی عہدِ پیری بلکہ مرتے دم تک قائم رہا۔ جس سے جس قسم کی ملاقات تھی، اس سے ہمیشہ وہی ارتباط رہا۔ جس کام کے لیے جو وقت مقرر کر رکھا تھا، اس میں کبھی فرق نہ آیا۔ اشرف نے تمام عمر شادی نہیں کی اور نہایت نیک نامی اور اتقا کے ساتھ زندگی بسر کی۔ آپ نواب اصغر علی خان صاحب نسیم دہلوی کے قدیم اور رشید شاگردوں میں تھے۔ ناسخ، آتش، خلیل، وزیر، صبا، رند کی محفلوں میں شریک رہے۔ مگر اپنے طرزِ کلام میں اساتذۂ دہلی بالخصوص اپنے استاد کا تتبع کرتے رہے اور باوجود کششِ ہم وطنی و تعلقاتِ روزمرہ طرزِ لکھنؤ کے اثر کو غالب نہ آنے دیا۔ اچھے اچھے مضامین پاک اور لطیف زبان میں بڑے سلیقے سے ادا کرتے تھے۔ حق یہ ہے کہ آپ کا کلام گو سارا ایک ہی مرتبے کا نہیں ہے۔ لیکن اکثر مشاہیر کے کلام سے لگا کھاتا ہے۔ اپنے استاد مرحوم سے ایسی عقیدت رکھتے تھے کہ فدائی کا رتبہ حاصل تھا۔ منشی امیر اللہ صاحب تسلیم کے گہرے دوستوں میں تھے۔ ساٹھ برس تک ہم مشق و ہم صحبت رہے۔ الغرض اساتذۂ قدیم کی ایک قابلِ قدر یادگار تھے۔ غزل کے علاوہ تاریخ گوئی میں بھی بڑا ملکہ حاصل تھا چنانچہ مطبع نولکشور یا دیگر کتب مطبوعہ لکھنؤ میں عموماً آپ کی تاریخ ہوتی تھی۔ ان کے دو اردو دیوان مکمل موجود ہیں۔ ۸۵ برس کی عمر پاکر ۱۹۰۲ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ (۳۸)

اشرف میرے کلام کی رنگینیوں نے آج ـــــ دامنِ سخن کا دامنِ گلزار کر دیا
مضمون نیا، زمیں نئی، طرز بھی نیا اشرف یہ ہے نسیم سے استاد کے لیے

اشرف کر و جلائے وطن اختیار اب جب تک کہ سلطنت تھی مرا لکھنؤ میں تھا

اشک

اشک، مولوی حاجی ہادی علی اشک لکھنوی۔ خلف شیخ حسین علی بجنوری، شاگردِ رشید فتح الدولہ برق لکھنوی۔ فارسی کے بھی شاعر تھے۔ آپ اپنے استاذ کے ہمراہ کلکتے بھی گئے تھے۔ غدر کے بعد مطبع محمدی میں بطور مصحح کام کرتے رہے۔ صنعتِ تاریخ گوئی میں اچھی مہارت تھی۔ عربی کا خطِ نسخ نہایت عمدہ لکھتے تھے۔ منشی نول کشور کے مطبع میں اُن کے ہاتھ کا قرآن مجید چھپا تھا، جو نہایت خوش خط اور صحیح مانا جاتا ہے۔ اکثر فارسی درسیہ کتابوں پر، جو اس مطبع میں چھپیں، حاشیہ اور شرح حاشیہ بھی آپ ہی لکھا کرتے تھے۔ آپ کا اردو دیوان شائع ہو چکا ہے۔ ۱۸۸۱ء میں انتقال فرمایا۔ (۸)

اشک آنکھوں میں کبھی آہ کبھی ہے لب پر ۔۔۔ درد ہر وقت نئی طرح کا پایا دل میں

ہمدموں، کشتہ ہوں میں تیغِ نگاہِ یار کا غسلِ میت کے لیے پانی ملے تلوار کا

اعجاز

اعجاز، شیخ منشی محمد عبدالعزیز معروف بہ اعجاز رقم ابن محمد صالح ساکن سہسوان ضلع بدایوں، ان کا تاریخی نام آغا میر ہے، جس سے ۱۲۵۲ھ نکلتے ہیں۔ ایامِ طفولیت میں اپنے والدین کے ہمراہ لکھنؤ آئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ فنِ سخن کی تحصیل اوّل مولوی الٰہی بخش نازش اور پھر اسیر لکھنوی سے کی۔ اخیر میں امیر مینائی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ اب کہتے کہتے مشاقی ہو گئی ہے۔ خطِ نستعلیق میں منشی کالکا پرشاد موجد سے اصلاح لی ہے۔ ۱۸۵۷ میں ریاست بھوپال میں تعلق پیدا کیا۔ فارسی میں مولانا عباس رفعت کے شاگرد ہیں۔ بارہ برس بھوپال میں ملازمت کر کے گوالیار چلے آئے، ۲۱ سال وہاں رہے۔ اب چند سال سے پھر بمقام بھوپال نواب یٰسین محمد خان کی سرکار میں ملازم ہیں۔ تاریخ عمدہ اور بہت جلد کہتے ہیں۔ خوش نویسی میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے۔ یہ کلام کا نمونہ ہے۔ (۱۰)

بلا آئے، وبال آئے، غضب آئے، اجل آئے ۔۔۔ نہ آئے پر نہ آئے دل کسی انساں کا انساں پر

کیا ہے بے خودی نے نیک و بد سے بے خبر ایسا ۔۔۔ کہ شکوہ دوست کا کرتا ہوں میں جا جا کے دشمن سے

انور

سلطان الشعرا سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا مرحوم دہلوی۔ آپ سید جلال الدین حیدر مرصع رقم خوش نویس و استاد ابوظفر بہادر شاہ ثانی کے خلف اصغر اور فخر اساتذہ مولانا ظہیر دہلوی کے چھوٹے تھے۔ انور مرحوم بڑے ذکی اور طباع شاعر تھے۔ اوائل مشق میں خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق سے استفادہ کیا۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا غالب سے مشورہ لیتے رہے۔ طبیعت نہایت دِقت پسند اور مضمون خیز واقع ہوئی تھی۔ [illegible] چلبلاہٹ، فکر کی رسائی، روزمرہ کے نئے نئے الوٹ فریفتگانِ سخن کے دماغ میں عجیب سرور اور عاشق مزاجوں کے دلوں میں غضب کا درد پیدا کرتے تھے۔ جو شعر دیکھو پھڑکتا ہوا۔ حسنِ خیال، بلندیِ [illegible] ون پر نظر ڈالو تو ایک خوش آئند حیرت پیدا ہوتی ہے۔ اس جوان طبیعت کو خدا نے وہ مضمون آفرینی بخشی تھی کہ شعر سن کر بوڑھوں کے ٹھٹھرے ہوئے دلوں میں عشق کی اُمنگ پیدا ہو جاتی تھی۔ افسوس ہے کہ اس جوان مرگ نے عالمِ شباب میں اپنی موت کا داغ دیا۔ اگر آج انور زندہ ہوتے تو ہر جگہ ان کا ہی نور جھلکتا نظر آتا اور ان کے سامنے کسی کا چراغ روشن نہ ہونے پاتا۔ مگر اس مرحوم کا کلام اس ناپرسی اور ناقدری کے زمانے میں بھی انصاف پسند طبائع کو اپنے کمال کا معترف بنائے بغیر نہیں چھوڑتا۔ اس قدر دِقت پسند اور نازک خیال ہونے کے باوجود مشاقی اور پُرگوئی کا یہ عالم تھا کہ کیسی ہی مشکل زمین کیوں نہ ہو تعدادِ اشعار میں کمی نہ آتی اور ایک ایک قافیے کو کئی کئی طرح سے ادا کرتے۔ اکثر مشاعروں میں مصرع طرح پر سہ غزلہ اور چو غزلہ کی نوبت آجاتی۔ جس بحر اور جس قافیے میں مضمون کی گنجائش نہ ہوتی، اسی میں گوہرِ مضمون نکال کر دکھا دیتے۔ غدر سے دس برس بعد جو دلی میں مشاعرے کا سلسلہ شروع ہوا تھا، اس کی روحِ رواں انھیں کہنا چاہیے۔ حضرت داغ، مولانا ظہیر، حالی، مجروح، سالک، عزیز، ارشد، مشاق، ان مشاعروں میں شریک ہو کر دادِ سخن دیا کرتے تھے۔ ثقات سے سنا گیا ہے کہ اکثر یونہی ہوا کہ ان کی غزل سب پر فوق لے گئی۔ حکیم مومن خان صاحب مومن نے خیال گوئی کی جو ایک خاص طرز ایجاد فرمائی تھی، جس کا ان کے زمانے ہی میں شہرہ ہو گیا تھا، اگر اس کے موجد مومن تھے تو پورے پورے مقلد حضرت انور۔ اگر نگاہِ غور سے دیکھا جائے تو جیسا ان کی طرز کو حضرت انور

نے نباہا ہے اور کسی سے نہ بن پڑا۔ اس طرح مرزا غالب کی استعارہ بالکنایہ کی خوش اسلوب ترکیب کی تقلید انور مرحوم کے برابر کسی سے نہیں ہوئی۔ الغرض ذوق، غالب اور مومن کے جداگانہ طرزوں کو سمو کر مرحوم نے ایک خاص رنگ ایسا ہر دلعزیز پیدا کیا تھا جو سب کے دلوں میں نقش ہوگیا۔ حضرت انور کو افکارِ زمانہ نے نہایت تکلیفیں پہنچائیں۔ دست بردِ غدر سے ایسے پریشان ہوئے، کہ ترکِ وطن کرکے جے پور جا رہے۔ بعد کو وہیں ۳۸ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ ان کے دو مکمل دیوان تلف ہوگئے، جن میں سے ایک تو خاص حمد و نعت اور تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مولفِ تذکرہ نے بڑی محنت اور مشقت سے متفرق و پریشان مسودوں سے ایک دیوان مرتب کرکے چھپوایا ہے۔ مگر یہ ان کے کلام کا آٹھواں حصہ بھی نہیں ہے اور اس میں بیشتر ایسا کلام ہے جو نظرِ ثانی سے محروم رہا۔ یہ بھی امر قابلِ ذکر ہے کہ استاد ذوق کے مروجہ دیوان کی اشاعت میں انور مرحوم کا نام شکریے کے ساتھ یاد رکھنے کے قابل ہے کیوں کہ یہ دیوان حافظ ویران، حضرت ظہیر اور انور کی متحد سعی و کوشش کا نتیجہ ہے۔ خوش نویسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ معظمی و محترمی شمس العلما مولانا حالی نے راقم کی تحریک سے جو تقریظ ان کے دیوان پر لکھی ہے قابلِ دید ہے۔ اب انتخابِ کلام ملاحظہ ہو: (۱۳۳)

دل میں بحرِ الفتِ ساقی ہے انور موج زن ـــــ جانتا ہوں ایک قطرہ کوثر و تسنیم کو
مسیحائی کرو مرتے ہیں تم پر ـــــ خلاصہ ہے یہ اپنی داستاں کا

انور

انور، منشی محمد انور لکھنوی، خوش نویس و مصلح سنگ، کلکتے کے امیر الاخبار کے مطبع میں کتابت کرتے تھے۔ دو تین سال ہوئے دہلی میں انتقال کیا۔ حضرت داغ کے شاگردوں میں تھے۔ کلام ہدیۂ احباب ہے۔ (۴)

شاید اے بلبلِ شیدا یہ تیری تاک میں ہے ـــــ آج گلشن سے جو ہلتا نہیں صیاد کہیں
یاس سے دیکھا جب، وہ کہنے لگے ـــــ دل میں کیا ہے، بتائیے تو سہی

اویسی

اویسی، منشی غلام محی الدین خان متوطن سرہند، حضرت سید حسن رسول نما صاحب کے

خاندان کے مرید اور مردِ قابل و ذہین، صاحبِ فکرِ سلیم، خوش نویس کامل اور درویش سیرت بزرگ تھے۔ قرآنِ شریف کی ایک تفسیر نظم میں خوب لکھی تھی جس میں طرح طرح کے صنائع و بدائع ملحوظ رکھے تھے۔ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں داد خوش کلامی دیتے تھے۔ تذکرہ شوق کی ترتیب کے وقت زندہ و سلامت تھے۔ شیفتہ نے انھیں بریلی کا باشندہ لکھا ہے اور ان کا دکن جانا بھی درج ہے۔ (۸)

ذکر و شغل اب تو اویسی کا یہی آٹھہرا ___ کچھ کٹی رونے میں کچھ تیری حکایات میں رات
کس طرح چھوڑ سکوں تیری گلی کو جانا ___ سر اگر جائے تو جاوے، یہ قدم رُکتا ہے

بلند

بلند، مرزا صفدر علی بیگ خلف مرزا فضل علی بیگ ساکن کھاری باؤلی (دہلی) الور کے سرِ رشتہ تعلیم میں ملازم اور مرزا صابر دہلوی کے شاگرد تھے۔ نہایت دوست نواز اور قابل شخص تھے۔ علمِ حساب کے عدد، نستعلیق اور شکستہ اچھا لکھتے تھے۔ کچھ دنوں تھانے دار بھی رہے۔ طبیعت میں بے حد شوخی تھی۔ کلام یہ ہے:

قیس و فرہاد و وامق اور بلند ___ عشق میں جو رہا خراب رہا
تیرے ہرجائی پن نے اے بے مہر ___ مجھکو عالم سے شرمسار کیا

پیر

مصر مہاراج سنگھ ساکن متھرا، ذات کے چوبے اور جائے تعجب ہے کہ بہت کم خوراک تھے۔ خط شکستہ کی تحریر میں اچھی مہارت حاصل تھی۔ اوائل میں جوان تخلص کرتے تھے۔ پھر پیر تخلص اختیار کیا۔ دہلی قبل از غدر اکثر آیا کرتے تھے۔ (۳)

میں وہ خاکستر آفسردہ ہوں جوں صبح کہ پیر ___ داغ خورشید سے اگ اخگرِ سوزاں میرا
قبر پر فریادیوں کے اپنے تو ہرگز نہ جا ___ تیرا پیچھا کب چھٹا اس خاکِ دامن گیر سے

تمکین

میر ہدایت علی متوطن قصبہ کندر کی ضلع مراد آباد۔ نہایت ذہین اور طباع اور علوم و فنونِ عربی و فارسی میں دست گاہِ کامل رکھتے تھے۔ خوش نویسی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ

اکثر خطوط متداولہ نہایت عمدگی سے لکھتے تھے - تمام عمر درس و تدریس میں بس کی - فارسی شعر اکثر اور ریختہ بہت کم کہتے تھے - متقی، پرہیزگار و ادیبِ کامل تھے - قدرت اللہ شوق کے تذکرے کی ترتیب کے وقت یعنی بارھویں صدی کے آخر تک زندہ تھے - چند شعر انہی کے تذکرے سے انتخاب کر کے درج کیے جاتے ہیں، جن سے تلاش الفاظ و مضامین اور رنگین بیانی کا پتا چلتا ہے - ملاحظہ ہوں: (۲۵)

ہر چند شب کے رہنے کی ہے گھر جگہ ولے — تمکین کوئے یار شبستان ہے دوسرا
تمکین غزل کا کہنا تیرا ایسی طرز میں — ظاہر ہے یہ کہ خوبیِ ذہنِ رسا ہے یہ

ثریا

عالی جناب شاہ زادہ ثریا قدر مرزا محمد تقی علی بہادر المتخلص بہ ثریا ابن عالی جناب مستطاب معلی القاب ہز ہائی نس شاہ زادہ عالم و عالمیان یادگار اودھ پرنس سلیمان قدر مرزا محمد حسن علی بہادر دام اللہ اقبالہ، برادر زادہ و خویش سلطانِ عالم حضرت محمد واجد علی شاہ جنت آرام گاہ۔ دسمبر ۱۹۰۳ میں راقم تذکرہ سے بمقام لکھنؤ ملاقات ہوئی تھی - ۳۸ - ۳۹ سال کی عمر ہے - دربار گورنری میں آپ کا چھٹا نمبر ہے - آپ کو سنِ طفولیت سے ہی ہر علم و ہنر کا شوق رہا - کئی زبانیں جانتے ہیں اور صنعت و حرفت میں بھی مہارت ہے - ہر فن میں دست گاہ ہے مصوری، نقاشی، خوش نویسی، فنِ سپہ گری اور نظم و نثر میں اچھا ملکہ ہے - مرثیہ، واسوخت، قصائد، غزل وغیرہ جملہ اصنافِ سخن پر قادر ہیں - علاوہ ازیں علمِ ہیئت و ہندسہ، نصائح و فلاسفی وغیرہ سے بخوبی واقف ہیں - آپ کا ذہنِ رسا و جودتِ طبع خداداد ہے - فنِ شعر کا مذاق وراثتاً ملا ہے - اکثر مشاعرے بھی کرتے رہتے ہیں - زبان صاف، روزمرہ سلیس، نشستِ الفاظ مرغوب ہے - اکثر دشوار و سنگلاخ زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے، جس سے ان کی مشاقی ظاہر ہے - ایک رسالہ آپ کے کلام کا شائع ہو چکا ہے - اس میں سے چند شعر اپنے مذاق کے بموجب انتخاب کر کے پیش کرتے ہیں: (۲۶)

اٹھا بارِ امانت، اے ثریا! جز بشر کس سے — یہ مشتِ خاک، رازِ حق تعالیٰ کی امیں نکلی
اے ثریا محو تھے نظارۂ گل میں ہزار — ہاتھ سے صیاد کے جو کھا گئی بلبل شاخ پر

جان

جان عالم خان لکھنوی خلف نواب منور خان مغفور، برادرِ خرد نواب روشن الدولہ ظفر خان فنِ سخن سے میر سوز مرحوم سے اصلاح لیتے تھے۔ فی الجملہ علومِ عربیہ سے واقف تھے۔ خطِ نستعلیق و شکستہ میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ یہ ان کے اشعار ہیں: (۴)

اس سنگدل کے دل میں ذرا بھی نہ راہ کی ۔۔۔ دور از اثر سدا رہی ہت تیری آہ کی
بیٹھا ہوں یار آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ۔۔۔ جوں تا بداں میں شیشۂ رنگیں بھرے ہوئے

حسن

مولوی سید امیر حسن صاحب مرحوم تخلص حسنؔ ابن حاجی سید اکبر علی صاحب مرحوم ساکن سہارن پور، سادات موسوی اثنا عشری تھے۔ ان کے جدِ اعلیٰ سید عبد الہادی صاحب عرف شاہ چراغ کاشان سے سلطان محمود غزنوی کے ہم راہ ہندوستان میں آئے تھے۔ مولانا حسن نے تقریباً پچاس سال تک سرکارِ انگریزی کی عدالت ہائے ضلع میں وکالت کی۔ جائداد آبائی بھی بہت کچھ تھی۔ نہایت متقی و پرہیزگار، عربی و فارسی میں استعداد کامل رکھتے تھے۔ اس لیے اوقاتِ فرصت میں شغلِ درس بھی جاری رہتا تھا اور علمی مباحثات اور اہلِ علم و فن سے ان کی صحبت ہمیشہ گرم رہتی تھی۔ لکھنؤ، دہلی کے باکمال سہارن پور میں وارد ہوتے تو انہی کے مہمان ہوتے۔ خوش نویس بھی اعلیٰ درجے کے تھے۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ملک الشعرا مولوی مہدی علی خان صاحب مراد آبادی اکثر ان کے یہاں آکر مقیم ہوتے تھے۔ چنانچہ انہی سے تلمذ اختیار کیا تھا۔ سہارن پور کے مقتدر شرفا اور عمائد میں گنے جاتے تھے۔ دہلی و لکھنؤ بھی گئے اور وہاں کے اہلِ کمال سے مل کر دادِ سخن دینے اور لینے کا موقع ملا۔ آخر میں بوجہ پیرانہ سالی اور داغِ مرگِ فرزندِ جوان کی وجہ سے حواس میں اختلال آگیا تھا۔ ۱۸۸۹ء میں ۸۰ برس کی عمر میں انتقال کیا اور سہارن پور میں دفن ہوئے۔ افسوس کہ کلام مصنف کے امراضِ دماغ اور ورثا کی کم التفاتی سے تلف ہوگیا۔ اس لیے جو کچھ دست یاب ہوا، حاضر کیا جاتا ہے: (۱۱)

زلف و رخ انتخاب ہیں دونوں ۔۔۔ روز و شب کے جواب ہیں دونوں
کام کے آدمی تھے قیس و حسنؔ ۔۔۔ عشق میں پر خراب ہیں دونوں

حسن

سید علی حسن شاہ جہان آبادی۔ آپ شجاع، تیر انداز، خوش نویس، دست کار، فن بانک و پٹہ میں مہارت کامل رکھتے تھے اور باہمہ صفت موصوف تھے۔ صاحبِ غیرت ایسے تھے کہ اگرچہ عدمِ مساعدتِ روزگار سے پریشان رہے مگر کسی سے اپنی حاجت کا اظہار نہ کیا۔ طبع موزوں تھی، یہ چند اشعار ان کی یادگار ہیں:

ناز آئینے پہ اتنا یہ سکندر مت کر ـــــ کیا تماشا ہو جو سینے سے دل آوے باہر
یہ تم جانو ہو بجلی کو سکھائیں کس نے اچپلیاں ـــــ ہمارے دل ستی تعلیم نے سیکھی ہے بے کلیاں

حیران

حافظ بقاء اللہ خلف حافظ ابراہیم۔ یہ دونوں باپ بیٹے خط نسخ و نستعلیق خوب لکھتے تھے۔ شعر و سخن کا بھی مذاق تھا۔ ۱۸۴۸ء میں زندہ تھے۔ یہ ان کے کلام کا انتخاب ہے: (۶)

حیرآن کو بعد مرگ تکلف نہیں ضرور ـــــ اک مشتِ استخواں ہے لے کے داب دو
کہدو مرے مزار پہ کوئی نہ لائے گل ـــــ چھاتی پہ میری داغ ہیں کافی بجائے گل

دارا

صاحب عالم و عالمیان میرزا محمد دارا بخت دارا مرحوم عرف مرزا شبو، ولی عہد اوّل حضرت ظل سبحانی محمد بہادر شاہ اخیر بادشاہ دہلی۔ شاگردِ رشید ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوقؔ۔ ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء میں بعمر پچاس انتقال فرمایا اور شاہ چراغ دہلی کے مزار کے قریب میں دفن ہیں۔ آپ حضرت ابوظفر کے خلف اکبر تھے اور مشہور ہے کہ عمر میں صرف بارہ برس چھوٹے تھے۔ ان کی والدہ زکیۃ النسا بیگم مرزا سلیمان شکوہ کی دختر تھیں، جو اکبر شاہ کے حقیقی برادرِ خرد تھے۔ آپ کے آٹھ اور بقول بعضے بارہ فرزند دلبند تھے، جن میں سے دو میرزا احمد اختر اور نصیر الملک اب بقیدِ حیات ہیں، اور ایک صاحب زادی بھی زندہ و سلامت موجود ہیں۔ میرزا دارا بخت صاحب مولانا فخر الدین کے خلیفہ تھے اور میر محمدی صاحب سے بھی استفادہ کیا تھا، اور مولانا عماد الدین کے خط نسخ اور نستعلیق میں شاگرد تھے۔ بہت نیک خصلت، بھولے بھالے شاہ زادے تھے۔ آپ کے کلام میں حضرتِ ذوقؔ کا رنگ صاف جھلک رہا ہے۔ انتخابِ کلام ہدیۂ ناظرین ہے: (۲۵)

کوئی بھی ساتھ کسی کے گیا نہ اے دارا ـــــ عدم کو جاتا ہے کیا قافلہ جریدوں کا
ہم سے اے دارا وہ کب ہوتا ہے صاف اس کے دل میں بدگمانی اور ہے

راغب

حافظ یار خان خلف الصدق نواب ذوالفقار خان ابن حافظ الملک حافظ رحمت خان نصیر جنگ، جوان، وجیہہ، صاحب حوصلہ، مجمع قابلیت، صاحب علم و فن، خوش نویس، انشا پرداز، کبھی کبھی شعر فارسی اور ریختہ میں کہہ لیتے تھے۔ یہ چند شعر ان کے کلام سے تذکرہ قدرت اللہ شوق سے منتخب ہوئے۔ (۹)

غیر سے چاہ جب تمہاری ہو ـــــ دیکھے شکل کیا ہماری ہو
نہ ہوگا فرق کچھ صاحب تمہاری قدر و عزت میں کسی روٹھے کو اپنے گر مناؤ گے تو کیا ہوگا

راقم[1]

خلیفہ غلام محمد راقم دہلوی۔ لکھنؤ جانے سے پیشتر حکیم قدرت اللہ خان قاسم سے عربی، فارسی کی انشا پردازی کے سبق لیے تھے اور شاعری میں بھی انہی کے شاگرد تھے۔ معلم پیشہ تھے اور طب میں دخل تھا۔ خوش نویسی میں فرد تھے۔ فارسی شعر کا بیشتر اور اردو کا کم تر شوق تھا۔ (۶)

نے دیر میں کچھ ہے نہ حرم میں کچھ ہے نے ہستی میں کچھ ہے نہ عدم میں کچھ ہے
دنیا ہے طلسمات عجائب راقم دم میں کچھ ہے اور ایک دم میں کچھ ہے

رخشان

عالی جناب نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر مرحوم جاگیردار ریاست لوہارو خلف اصغر فخر الدولہ نواب احمد بخش خان والی ریاست فیروز پور۔ نواب احمد بخش خان نے اپنے حین حیات بڑے لڑکے شمس الدین احمد خان کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا اور پرگنہ لوہارو جو مہاراجہ الور نے بطور انعام دیا تھا، اپنے چھوٹے صاحب زادوں امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان کو بطور مدد معاش دے دیا

---

[1] راقم نہ صرف خوش نویس تھے بلکہ خوش نویسی کی تاریخ کے اہم مورخ بھی تھے۔ راقم کی شہرہ آفاق کتاب تذکرہ خوش نویساں بہ تصحیح و ترتیب مولوی ہدایت حسین مرحوم ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (کلکتہ) سے ۱۹۱۰ء میں چھپ چکی ہے۔

تھا۔ چند سال بعد نواب شمس الدین احمد خان کی حرکاتِ زبوں کے باعث ریاست فیروز پور ضبط سرکار ہوئی، مگر ریاست لوہارو بحال رہی۔ نواب صاحب ممدوح نواب اسد اللہ خان غالبؔ سے علاوہ قرابت قریبہ کے سلسلۂ تلمذ رکھتے اور ان کے خلیفۂ اوّل تھے۔ انتظامِ ریاست شروع سے نواب امین الدین خان کے سپرد رہا اور ان کی وفات کے بعد ان کے بلند نام صاحب زادے نواب علاؤ الدین خان مسند نشین ہوئے اور نواب ضیاء الدین خان صرف جاگیر دار نسلاً بعد نسل تصور کیے گئے۔ نواب صاحب مذکور رؤسائے شاہ جہان آباد میں نہایت ذی اقتدار اور بارسوخ تھے۔ ان کی اعلیٰ خاندانی ذاتی شرافت اور علم و فضل کی وجہ سے حکامِ وقت ان پر خاص توجہ مبذول فرماتے تھے۔ نواب صاحب اعلیٰ درجے کے سخن سنج اور سخن فہم اور تاریخی معلومات کا سرچشمہ مانے جاتے تھے۔ بڑے غیور اور پابند وضع رئیس تھے۔ بلوۂ غدر کے بعد ان کی ذات والا صفات دہلی میں غنیمت سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ جو شخص کسی فن کا ماہر یا کامل دہلی آتا تھا تو آپ کے فیضِ صحبت سے ضرور مستفید ہوتا تھا۔ علمِ تاریخ سے نہایت ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ جس وقت ایلٹ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے اپنی ضخیم تاریخِ ہند مرتب کی تو فراہمیِ حالات و تواریخ قدیم میں نواب صاحب نے بڑی امداد کی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں گاہ گاہ فکرِ سخن فرماتے تھے۔ اُردو میں رخشاںؔ اور فارسی میں نیرؔ تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں انتقال فرمایا اور درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ واقعہ مہرولی میں دفن ہوئے۔ تاریخ وفات مولوی رضی الدین خان دہلوی نے جو سلسلۂ حضرت امیر پنجہ کش، خوش نویس ہیں، ایک صوری و معنوی تاریخ کہی ہے۔ اور بے مثل مادہ ہے، جس پر مصرعے مولانا حالی نے لگائے ہیں:

چون ضیاء الدین احمد خان کشید — رخت از دنیا سوئے دار السلام
گفت ہاتف بارضی سالِ وفات — روز شنبہ سیزدہ شہر صیام

حضرت نیرؔ رخشاں کا کلام متانت سے پُر، عالمانہ مذاق سے معمور ہے۔ استاد والا قدر کے تلمیذ رشید تھے۔ چنانچہ کلام میں بھی انہی کی طرز کا اتباع ہے۔ ان کی اور ان کے خاندان کی زبان دہلی میں مستند مانی جاتی ہے۔ پاکیزہ اور نازک خیالات کی بندشِ خاص انہی کا حصہ ہے۔ کاش نواب احمد سعید خان صاحب طالبؔ کہ خود بھی اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں، اپنے والد مرحوم کا

کلام چھپوادیں تاکہ نواب صاحب مرحوم کی پُرفیض زندگی کی دوامی یادگار رہ جائے۔ آپ کے بڑے صاحب زادے نواب شہاب الدین احمد خان کا انتقال آپ کی حیات ہی میں ہو گیا تھا۔ ان کے بیٹے جناب سائلؔ دورِ موجودہ کے مشہور کہنے والوں میں ہیں۔ (۳۱)

آنکھوں میں آ گیا کوئی لختِ جگر نہ ہو — رخشاں جو آتے آتے ابھی رک گئے ہیں اشک
لے کے گل قبر پہ رخشاں کی نہ آیا کیجیے — بوالہوس اور بھی مرنے کی کریں گے خواہش

(باقی آئندہ)

الفہرست

محمد بن اسحاق ابنِ ندیم وراق

اردو ترجمہ : محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری تک کے علوم و فنون، سیر و رجال اور کتب و مصنفین کی مستند تاریخ ہے۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں، قرآنِ مجید، نزولِ قرآن، جمع قرآن اور قرائے کرام، فصاحت و بلاغت، ادب و انشا اور اس کے مختلف مکاتبِ فکر، حدیث و فقہ اور اس کے تمام مدارسِ فکر، علمِ نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و حساب، سحر و شعبدہ بازی، طب اور صنعتِ کیمیا وغیرہ تمام علوم، ان کے علما و ماہرین اور اس سلسلے کی تصنیفات کے بارے میں اہم تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں واضح کیا گیا ہے کہ یہ علوم کب اور کیوں کر عالمِ وجود میں آئے۔ پھر ہندوستان اور چین وغیرہ میں اس وقت جو مذاہب رائج تھے ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اس دور میں دنیا کے کس کس خطے میں کیا کیا زبانیں رائج اور بولی جاتی تھیں اور ان کی تحریر و کتابت کے کیا اسلوب تھے۔ ان کی ابتدا کس طرح ہوئی اور وہ ترقی و ارتقا کی کن کن منازل سے گزریں۔ ان زبانوں کی کتابت کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔

ترجمہ اصل عربی کتاب کے کئی مطبوعہ نسخے سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور جگہ جگہ ضروری حواشی دیے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

صفحات ۹۴۶ مع اشاریہ — قیمت -/۳۰ روپے

ملنے کا پتا : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور